ڈاکٹر روبینہ ترین

آزاد بحیثیت شاعر

Creative genius of Muhammad Hussan Azad 1830-1910 remained pendulous between Indo Persian tradition and dominant force and wisdom of west. Despite his love in broad day light for Lahore, he used to whisk away Delhi following his dreams to rediscover his source of spontaneous creatively. Basically he was a fiction writer, though his contribution is categorized as literary history, linguistics and allegory like wise his poetic spark has been considered as buried in the ashes of his efforts to appease the all powerful officers of Punjab Education Department.

آزاد کی تخلیقی روح عجم اور فرنگ کے بیچ اس طرح معلق ہے، جیسے وہ ہوش میں رہ کر لاہور سے محبت کرتے تھے مگر ہوائے خواب کے دوش پر دلی پہنچ جاتے تھے۔ اس نگارخانے نے ان کے دل و دماغ میں جو نقش ابھارے تھے، وہ بطور تخلیق کار انہیں لازوال بنانا چاہتے تھے مگر دانشمندِ فرنگی کا تقاضا تھا کہ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں موضوعاتی نظمیں پڑھو اور لکھو اور انعام کے ساتھ مراتب پاؤ، جس سے ناقدین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آزاد کی شاعری، اس کی قصہ گوئی کی محض راکھ ہے اور قصہ گوئی بھی وہ جو کبھی تاریخ، کبھی تاریخِ ادب اور کبھی تمثیل میں جلوہ گر ہوئی۔ اردو ادب کے طالب علموں نے عمومی طور پر رفتہ رفتہ آزاد کی شاعری اور ان میں سے بھی نصاب میں جزوی طور پر شامل مثنویوں کو پڑھنے کی بجائے ناقدین کے سرسری تبصروں پر انحصار کیا۔ جب کہ ضرورت اس بات کی رہی کہ محمد حسین آزاد کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد آزاد کے تخلیقی وصف کو اس کی شاعری اور نظریہ تخلیق شعر کے تناظر میں پرکھا جائے۔

محمد حسین آزاد کی ساری فکری اور جذباتی توانائیاں ماضی کے اس نگارخانے کو محفوظ کرنے کے لئے صرف ہوئیں جس کے بارے میں انہیں اندیشہ تھا کہ ان لوگوں کے دل اور دماغ سے یہ محو ہو جائے گا جن تک انگریزی لالٹینوں سے روشنی پہنچی ہے۔ ایسی لالٹینوں سے جن دماغوں تک روشنی پہنچی ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر محمد صادق کا ہے جو اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ بعنوان ''محمد حسین آزاد- احوال و آثار'' کے ساتویں باب ''آزاد بحیثیت شاعر'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''جس شاعری کا ۱۸۷۴ء میں اس شد و مد اور اتنی بلند توقعات کے ساتھ آغاز کیا گیا تھا وہ پیدائش ہی سے بے جان نکلی۔ تنقیدی دنیا مدت ہوئی اس پر فاتحہ پڑھ چکی ہے۔ پیشہ ور نقادوں اور طلبائے ادب کے سوا آج کوئی بھی آزاد کا حسن و عشق سے آزاد کلام نہیں پڑھتا اور وہ بھی بطور فرض نہ کہ برائے تسکین ذوق۔ معاصرین کے اندازے بسا اوقات غلط ہوتے ہیں بعد کی تسکین انہیں درست کرتی ہیں لیکن جہاں تک آزاد کی شاعری کا تعلق ہے اس معاملے میں اخلاف بڑی حد تک اسلاف ہی کے فیصلے سے متفق ہیں۔'' (۱)

اسی طرح ڈاکٹر محمد صادق کے تنتے ہوئے ابروآزاد کی مثنویوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ان کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ

-i ان مثنویوں کے موضوع فکری ہیں............ان کے مطالعے سے مطالب تو ذہن نشین ہو جاتے ہیں لیکن قاری کے جذبات واحساسات یا متخیلہ کو تحریک نہیں ہوتی یہ تحریک حسنِ بیان سے بھی ہوسکتی تھی لیکن یہ مثنویاں حسنِ بیان سے معرا ہیں علاوہ ازیں رسمی تکنیک کی تکرار سے ان کا لطف اور بھی جاتا رہتا ہے۔(ص ۱۱۱)

-ii آزاد میں تنقید ذات کی اہلیت کم ہے اور وہ اکثر اپنے کلام کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہتے تھے۔(ص ۱۱۶)

-iii مثنوی 'زمستان' میں جو مناظر پیش کئے گئے ہیں ان کا ہمارے ملک سے کوئی خاص تعلق نہیں............ یہاں آزاد اپنے وسط ایشیا کے مشاہدات قلمبند کر رہے ہیں۔(ص ۱۱۶)

-iv آزاد طبعاً شاعر نہ تھے یہاں شاعری سے مراد کلام موزوں ہے ورنہ آزاد کی نثر میں بار بار ایسے مقام آتے ہیں جہاں شاعری کی روح رواں دواں نظر آتی ہے............آزاد کی زندگی میں شاعری ایک سانحے کی سی حیثیت رکھتی ہے اور ان کا ادبی مقام متعین کرنے کے لئے ان کی نثر ہی کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔(ص ۱۲۲)

اسی طرح محمد حسین آزاد پر ڈاکٹریٹ کرنے والے نامور استاد اور ادیب ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے بھی دیکھئے:۔

''وہ صاحبِ طرز شاعر نہ تھے ان کی شاعری اعلیٰ ادبی اقدار کی حامل نہیں تھی لیکن ان کی تاریخی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔نظم اردو کے پودے کو انہوں نے پروان چڑھایا اور اپنے خونِ جگر سے ان کی آبیاری کی۔اردو شاعری میں تنوع، وسعت اور ترقی کی راہیں نکالیں اور روح عصر سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی۔(۲)

یہاں بادی النظر میں تو یہ رائے درست لگتی ہے کہ علم وادب کے میدان میں وہ نثر نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں اور بطور شاعر اُن کی ثانوی حیثیت ہی خیال کی جاتی ہے۔بلاشبہ' آبِ حیات'، 'نیرنگِ خیال'، 'سخندانِ فارس'، 'دربارِ اکبری' اور 'قصصِ ہند' ان کی ایسی نمائندہ تصانیف ہیں جو موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے آزاد کو بلند پایہ نثر نگار کے درجے پر فائز کرتی ہیں مگر یہ سمجھنا کہ انہوں نے محض کرنل ہالرائیڈ، ڈاکٹر لائٹز یا کسی اور کی خوشنودی کے لئے نظمیں لکھیں اور یہ قیاس کرنا کہ ان کے اندر ایک شاعر کی روح نہیں، قرین انصاف نہیں۔آزاد، کے ذوقِ شعر اور تخلیقی صلاحیت کے بارے میں ممکن نہیں کہ شک کا اظہار کیا جائے اسی طرح وہ اردو اور فارسی شعری روایت کا ایک رچا ہوا شعور رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مغرب میں بھی ادب وشعر سے متعلق اٹھائے جانے والے سوالوں سے مطلق بے خبر نہیں، تاہم انہیں اپنی شاعرانہ ترنگ کے ایک حصے کے ضائع ہو جانے کا ملال ضرور تھا، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

''کاش وہ دن جو میری عمر کی فصل بہار تھی طبیعت جوان تھی ان تصانیف میں خرچ ہوتے جن سے میرے دل کے ارمان نکلتے''(ص ۱۸۹)

گویا آزاد بھی ڈاکٹر صادق جتنا علم تو رکھتے تھے کہ حسن وعشق کا اظہار اردو شاعری کا بنیادی وصف کہلاتا ہے مگر انہیں ایسے حالات درپیش رہے اور ایسے علمی منصوبے ان کے پیشِ نظر رہے کہ وہ اپنے قلب وذہن میں موج زن اُن جذبات کو ظاہر نہ کر سکے، جو شاعری میں ان کا رُتبہ بڑھا سکتے تھے اور جن کی تلافی میں انہوں نے کئی برس عالمِ جنوں میں گذارے۔ تاہم یہ جو نظم اُردو کے لئے موضوعاتی مشاعرے منعقد ہو رہے تھے اور آزاد بھی بڑے شوق سے کسی میرِ مشاعرہ کی طرح نظمیں لکھ رہے تھے ان سے صرفِ نظر کیسے ممکن ہے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی ان ہی نظموں کے بارے میں لکھتے ہوئے ان تضادات سے کام لیتے ہیں، جو ہم اردو کے معلمین کا خاصہ ہے اور جس کی جھلک خود میری اس تحریر میں بھی ملے گی، وہ لکھتے ہیں۔

''آزاد کی ان تمام نظموں میں فلسفیانہ عمق اور گہرائی نہیں ملتی۔ان کی آواز میں بلند آہنگی بھی نہیں ہے بلکہ لہجہ ہر جگہ ایک ہی سا، رہتا ہے انہوں نے فارسی تقلید کے تباہ کن اثرات کا جا بجا ذکر کیا ہے لیکن اپنی نظموں میں وہ اس تقلید سے دامن نہیں بچا سکے۔ بلکہ بعض اوقات فارسی اثرات بڑے گہرے نظر آتے ہیں۔انہوں نے زمستان میں تاریخی داستانوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ سارا تذکرہ عجمی اور عربی تلمیحات پر مبنی ہے۔ملکی داستانوں کا ذکر محض ضمنی طور پر آ گیا ہے لیکن ان کی تشبیہیں طبعزاد ہیں۔اس سلسلے میں وہ فارسی کے اثر سے آزاد ہیں۔ ماحول کے سلسلے میں بھی انہوں نے ملکی خصوصیات کو مدِ نظر رکھا ہے۔ابر کرم کا ماحول کسی دوسرے ملک سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ اسی سرزمین کا عکس ہے۔''(۳)

انجمن پنجاب کے مشاعروں میں یہ منظم کوشش کی جا رہی تھی کہ اردو شاعری کو محدود یا پامال موضوعات سے بچائیں اور شاعروں کی نئی نسل کو بتائیں کہ شاعری پوری کائنات پر محیط ہے اس کے لئے صرف وہی موضوعات کافی نہیں ہیں جن پر بار بار طبع آزمائی کی گئی۔آبِ حیات میں مشاعروں کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کے شاعری کے بارے میں تصورات بھی سامنے آتے ہیں:۔

''یہ اظہار قابلِ افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے۔یعنی مضامین عاشقانہ، مے خواری مستانہ، بے گل وگلزار، وہی رنگ و بو کا پیدا کرنا، ہجر کی مصیبت کا رونا، وصل موہوم پر خوش ہونا، دنیا سے بے زاری اسی میں فلک کی جفا کاری اور غضب یہ ہے کہ اگر کوئی اصلی ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں، تو بھی خیالی استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔نتیجہ جس کا یہ کہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔میرے دوستو! دیکھتا ہوں کہ علوم وفنون کا عجائب خانہ کھلا ہے اور ہر قوم اپنے اپنے فن انشا کی دستکاریاں بھی سجائے ہوئے ہے۔کیا نظر نہیں آتا کہ ہماری زباں کس درجہ پر کھڑی ہے؟ ہاں صاف نظر آتا ہے کہ پا انداز میں پڑی ہے۔''(۴)

''شاعرانہ اُردو کا نوجوان جس نے فارسی کے دودھ سے پرورش پائی۔اس کی طبیعت میں بہت سے بلند خیالات اور مبالغۂ مضامین کے ساتھ وہ حالات اور ملکی رسمیں اور تاریخی اشارے آ گئے جو فارس اور ترکستان سے خاص تعلق رکھتے تھے اور بھاشا کے طبعی مخالف تھے۔ساتھ اُس کے فارسی کی نزاکت اور لطافتِ طبعی کے سبب سے اُردو کے خیالات اکثر ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ بچپن سے ہمارے کانوں میں پڑتے اور ذہنوں میں جمتے چلے آتے ہیں۔(۵)

چنانچہ گیارہ ماہ کے ان مشاعروں میں اسی بات کے لئے شعری گواہی دی گئی۔ان مشاعروں کے موضوعات زمستان، صبح امید، حب الوطنی یا اسی طرح کے غیر روایتی تھے اور اُن میں اظہار کے حوالے سے بھی نئے تجربات کئے گئے، اپنے مقاصد کی وضاحت کے لئے آزاد نے انجمن پنجاب کے لیکچرز میں جو کچھ کہا، وہ قابلِ غور ہے:

''اے خاکِ ہندوستان! اگر تجھ میں امراء القیس اور لبید نہیں۔تو کوئی کالی داس ہی نکال۔اے ہندوستان کے صحراؤ دشت! فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کر دو۔''(۶)

ان جملوں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ پہلا بڑا ادبی نقاد ہے جس کی توجہ اس بات پر ہے کہ ہندوستان میں اب جو بڑا تخلیق کار ہوگا، وہ ایسا شخص ہوگا جو عربی، فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں کی تخلیقی قوت سے آشنا ہوگا۔گویا امیر خسرو اور انشاء اللہ خان انشاء کے تتبع میں علم و ہنر اور ثقافتی میراث کی یکجائی شاعروں کے لئے ذریعہ عزت نہیں، تو محبوبیت کا معتبر وسیلہ ہے، سو آزاد ایسا شخص ہے جو روحِ ہندوستان سے محبت کرتا ہے ساتھ ہی ہند میں عرب وعجم کی روحِ جمال نے جو ہند مسلم کلچر پیدا کیا اُس میں عربی لحن، فارسی نَے اور سنسکرتی رس شامل تھا، آزاد اسی جرسِ غنچہ کی صدا کا تعاقب کرتا ہے، مگر امیر خسرو، انشاء اللہ خان

انشاءاورذوق کی طرح اس کے ہاں نشاطیہ رنگ غالب ہے۔آزاد کی ان مثنویوں سے چند مثالیں دیکھئے:۔

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
بجلی ہنسے تو رُخ ترا دیتا بہار ہے شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے
سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر

(مثنوی موسُوم بہ شبِ قدر،ص۵۴)

ہم عموماً ذوق کے قصائد کے اسلوب کا طنطنہ اور شکوہ کی بات کرتے ہیں بلکہ اُردو قصیدے کی تشبیب اور مرثیے کے آغاز میں بھی جس طرح مناظرِ فطرت کی نقش گری میں قدرتِ زبان کا اظہار کمالِ سخن تصور کیا جاتا ہے، حیرت انگیز طور پر محسوس ہوتا ہے کہ آزاد اسی سلوب میں منظر نگاری کر رہے ہیں۔

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر
کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق و برق سے رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے
محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

(مثنوی موسُوم بہ شبِ قدر،ص۵۵)

آزاد کی مثنویات میں صرف ایسی منظر نگاری ہی نہیں بلکہ سماجی و معاشرتی شعور کا اظہار بھی ہے۔مثنوی ''موسوم بہ شب قدر'' میں محمد حسین آزاد شاہ و گدا اور امیر و غریب طبقے کا ذکر کرتے ہوئے کہیں کہیں نظیر اکبر آبادی سے مماثل دکھائی دیتے ہیں۔خیال پسند اور خواب مست آزاد کے بارے میں احساس ہوتا ہے کہ معاشرے کی رنگارنگی پر اس کی نگاہ ہے کہ ایک ہی رات کی منظر کشی بادشاہ سے الگ طرح اور محنت کشوں اور فقیروں سے ایک اور طرح سے ملتی ہے، آزاد کے مشاہدے اور تخیل کا کمال ہے کہ ایک رات کے یہ مختلف روپ کیسے ڈرامائی تشکیل پاتے ہیں، محمد حسین آزاد کے اس وصف کا خوبصورت اظہار دیکھئے۔

اکثر امیر لیٹے ہیں نعمت کے ناز میں پر دل کو اُن کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں
سامانِ عیش سب ہیں مہیا کئے ہوئے جو مانگئے زمانہ ہے حاضر لئے ہوئے
مخمل کا فرش ہے مگر آرام ہی نہیں
جھپکے پلک سو اس کا کہیں نام ہی نہیں

(مثنوی موسُوم بہ شبِ قدر،ص۵۶)

اور ان کے زیرِ سایہ پڑا اک غریب ہے دن پر اٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے
تھا صبحدم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو وہ حق حلال کرکے گھر آیا ہے شام کو
اب اپنی نانِ خشک کو پانی میں چور کر کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور پر
سر پر قیامت آئے تو اس کو خبر نہیں

سونا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں

(مثنوی موسُوم بہ شبِ قدر،ص۵۶-۵۷)

آزاد کی ان تخلیقی صلاحیتوں کا ہدف انگریزوں کی خوشنودی کا حصول قرار دینا قرینِ انصاف نہیں۔ یہ ان کی تخلیقی صلاحیت کا کمال بھی ہے، زبان پر گرفت بھی اور معاشرتی شعور بھی ہے، جس نے ان کی منظر نگاری کو تنوع بھی دیا اور تاثیر بھی ، یہ اور بات کہ وہ رعایتِ لفظی کی لذت سے کبھی دست کش نہیں ہوتے۔

ہیں کتب خانہ ہستی میں بہت صاحبِ علم — اور بہت مدرسۂ دہر میں ہیں طالب علم
سوزِ محبت سے بہاتے ہیں پسینے اپنے — حسرتوں سے کئے لبریز ہیں سینے اپنے
نہ تو کھانے کا ہے کچھ فکر نہ پانی کا خیال — ذوقِ راحت ہے نہ ہے لطفِ جوانی کا خیال
ہوگئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح — بلکہ پیوندِ ورق ہیں جز اصلی کی طرح

(مثنوی موسُوم بہ دادِ انصاف،ص۱۰۱)

مثنوی 'حب وطن' میں دہلی کا ذکر ہے تو دکن کا بھی اور گھروں میں موجود لوگ ہیں تو مسافر بھی ، اسی طرح یورپ سے آئے ہوئے لوگ، جن کی تعریف کا وہ تھیسس بنانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر معاشرتی رویوں اور تبدیلیوں کے بیان میں ان کا حسنِ اظہار چھایا ہوا ہے۔ اسی طرح 'خوابِ امن' میں خسروِ انصاف کا دربار ہے سوالات زیرِ بحث ہیں کہ امن کیا ہے؟ اور علم کیا؟ اور ظاہر ہے کہ یہاں کریڈٹ انگریزوں کو دیا جاتا ہے کہ امن کا قیام اور ایک نظام کی تشکیل انہی کا مرہونِ منت خیال کیا جاتا ہے تاہم مثنوی موسوم بہ دادِ انصاف میں ایک نیا رویہ سامنے آتا ہے کہ حق دار کیسے آئے انصاف کیسے ملا۔

جب کہ تعمیل سے یہ حکم عمل میں آیا — تو گریبانِ ستم دستِ اجل میں آیا
پہلے اک فرقہ طلب برسرِ دربار ہوا — حکمِ دربار اسے اس طرح اظہار ہوا
کہ جو قبضہ میں ہو حقیقت و املاک کوئی — نقد یا جنس جہاں ہو تہِ افلاک کوئی
اُس پہ دعویٰ جسے کچھ ہو وہ بتا دیوے ابھی — اور جو کچھ پاس سند ہو تو دکھا دیوے ابھی
حکم یہ سنتے ہی دوڑے سوئے دربار بہت — کھلے اسناد و فرامین کے طومار بہت
آل تمغا تھے بہ طغرائے سلاطینِ سلف — اور مطلّا و مزّین تھے بہ آئینِ سلف
بہت اسناد و وثائق کے قبالے آئے — سیکڑوں مہر و شہادت کے حوالے آئے
پر نظر جب شہہ انصاف نے ڈالی اپنی — اور وہیں ہاتھ میں فانوس سنبھالی اپنی
پھر شہادت کوئی پوچھی نہ گواہی دیکھی — اور نہ مُہر و تُزکِ دفترِ شاہی دیکھی
جو جو اسناد کہ درپیشیٔ انصاف میں تھے — تھے کھلے یا کہ دھرے گوشہ واطراف میں تھے
انقلابوں نے زمانہ کے چھپایا تھا انہیں — یا کہیں خوفِ جرائم نے دبایا تھا انہیں

(مثنوی موسُوم بہ دادِ انصاف،ص۱۰۱)

اس طرح اب محض لطفِ بیان کا شیدائی شاعر پس منظر میں چلا جاتا ہے اور اپنی دنیا اور اہلِ دنیا کا گہرا مشاہدہ کرنے والا آزاد سامنے آ کر کئی پردوں میں چھپے لوگوں کے رویے بے نقاب کرتے ہیں ان لوگوں کی مکاری اور استحصال گردی عیاں کرتے ہیں جو بزعمِ خود، پارسا بنے رہتے ہیں۔ مثنوی موسوم بہ دادِ انصاف کے یہ شعر دیکھئے:۔

جب کرامات یہ اک اک نے سنائی اپنی — شہہِ انصاف نے فانوس ہلائی اپنی
معرفت شمعِ فروزاں لئے یک بار آئی — کرتی اصلیتِ اشیا کو نمودار آئی

مکر و تزویر ہوئے اُڑکے ہوائی سارے / کھل گئے زہد خدائی و ریائی سارے
جو یہ کہتے تھے کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں / بلکہ عورت کا کبھی ہم نے سنا نام نہیں
یاں جو دیکھا تو حریفِ مے و مینا نکلے / اُن کے پہچاننے والے بھی وہیں آ نکلے
یعنی کچھ عورتیں کرتی ہوئیں زاری دوڑیں / نان و نفقہ کی طلبگار بیچاری دوڑیں
بچے کچھ کہتے ہوئے دوڑے کہ بابا بابا / پر یہ شرمائے کھڑے تھے کہ کہیں کیا بابا
(مثنوی موسُوم بہ دادِ انصاف،ص ۱۰۵)

یہاں آزاد کا سماجی شعور ہے کہ وہ لبرل آدمی کے طور پر سامنے آتا ہے۔افسوس کہ اُن کی شاعری پر خاص طرح کا لیبل لگ گیا کہ انہوں نے انگریز آقاؤں کے کہنے سے موضوعاتی شاعری کی حالانکہ ان کا سماجی شعور اور سہولتِ اظہار انہیں اپنے معاصرین میں نمایاں کرتا ہے۔ اب لکیر کے فقیر اور تقریر کے کھلاڑی مولوی کے کردار کے بارے میں ان کا یہ نقطہءنظر دیکھئے جو'مثنوی نوطرز مرصع' میں یوں ظاہر ہوا ہے :۔

تھا پاس اک خرابۂ مسجد پڑا ہوا / ملاّ تھا اس میں برسرِ منبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامنِ تقریر کھینچتا / اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا
حور و قصور پر تھا دلوں کو لبھا رہا / دوزخ دکھا کے خلقِ خدا کو ڈرا رہا
تھے لوگ اس کی باتوں پہ مدہوش ہو رہے / اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے
دیکھا جو نوجوان کو اس مرد پیر نے / اپنی لکیر پیٹی پُرانے فقیر نے
یعنی کہ آؤ خُلد کا نقشہ دکھائیں ہم / بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اڑائیں ہم
(نوطرز مرصع،ص ۱۷۷)

اسی طرح مثنوی 'صبح امید' میں گندم نما جوفروش مذہبی رہنما کے بارے میں ان کے جذبات کا اظہار ان کے مذہبی و سماجی شعور کو ظاہر کرتا ہے۔

کرتے زاہد ہیں خدا کی جو عبادت دن رات / ترکِ دنیا سے ہیں سرگرمِ ریاضت دن رات
ذکرِ فردوس ہیں تو نے انہیں سنوائے ہوئے / لطف ہر دم ہیں وہی پیشِ نظر آئے ہوئے
رند آزاد جو ہر دم ہے گرفتارِ گناہ / بارِ عصیاں سے ہے بیچارہ گرانبارِ گناہ
نہیں جز رحمتِ حق کوئی سہارا اس کا / تیری ہی چشمِ کرم پر ہے گزارا اس کا
تو نہ ہووے تو تڑپ کر دل مضطر رہ جائے / وہ گنہگار تو غم سے ابھی مرکر رہ جائے
(مثنوی موسوم بہ صبح امید،ص ۱۷۰)

آزاد کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ ان کی شاعری میں عورت اور اس حوالے سے بنیادی جذبات واحساسات غائب ہیں حالانکہ ایسا نہیں،آزاد کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان نظموں میں بھی عورت کے حوالے سے اشعار ہیں۔

سنگِ مرمر کی لبِ آبِ جو اک سل ہے پڑی / اُس پہ اک رشکِ پری ہاتھ میں پھولونکی چھڑی
رنگِ رخ کو گلِ گلزار سے چمکائے ہوئے / بیٹھی اک پاؤں کو ہے پانی میں لٹکائے ہوئے
اس پہ ہے چتر کی باسایہ فگن سبز نہال / پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادشمال
نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے / فرش گلہائے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے
سر پہ جو اُس کے دھری ہے کلہٗ تاجوری / ہے بجائے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری

اس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ — کہ ہر اک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ
اس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے — ہر دماغ اس سے نئے ڈھب کا مزا لیتا ہے
رُخ جو ہے آئینہ روئے تمنا اس کا — شمع ساں چاروں طرف ایک ہے جلوہ اس کا
رکھتی ہے ایسا اثر نرگس جادو اس کی — پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر اک سو اس کی
ہے ہر اک شخص سمجھتا کہ اشارہ ہے مجھے — تڑپ اٹھتا ہے ہر اک دل کہ پکارا ہے مجھ

(مثنوی موسُوم بہ صبح اُمید،ص۶۳)

یہ درست ہے کہ آزاد کا تخلیقی ذہن بنیادی طور پر افسانہ نویس کا تھا،اس کی مرقع نگاری کا جاوداں وصف جس طرح 'آبِ حیات' میں جلوہ گر ہوا،اس سے ان کی شاعر کی حیثیت ثانوی ہوگئی۔ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں کہ:۔

'' آزاد کی نثر شعریت کی معراج ہے۔ان کی نظم صنعت گری کی اس منزل کو نہیں پہنچتی لیکن صرف اس وجہ سے اُن کی شاعری کو کم وزن، بے حقیقت اور بے کیف نہیں ٹھہرایا جاسکتا(۷)

محمد حسین آزاد نے مثنویاں،نظمیں،قصیدے،سہرے کے علاوہ غزلیں بھی لکھی ہیں،جن کا عموماً تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ان کے دو شعری مجموعے ہیں جن میں ''نظم آزاد'' میں تو گیارہ مثنویاں ہیں لیکن ''خُم کدۂ آزاد'' میں ۶۳ غزلیں، ۶ نظمیں،۲ سہرے،۱۰ قصائد اور سلام کے علاوہ چند اشعار شامل ہیں۔اب یہ بھی ایک طرح کا تاریخی مغالطہ ہے کہ آزاد غزل کا شاعر نہیں ہے اور اس کی تائید وہ کرتے ہیں جو شاید اس بات سے بے خبر ہیں کہ انہوں نے غزلیں بھی لکھیں اور ان غزلوں میں اس طرح کے اشعار بھی موجود ہیں۔

حرم میں شیخ ہیں اور مست دورِ جام میں ہیں — وہ اپنے کام میں ہیں اور یہ اپنے کام میں ہیں

(کلیاتِ نظمِ آزاد،ص۷۸)

ہوا معاملہ دل کا فقط نگاہ پہ طے — نہ کچھ حساب ہوا اور نہ کچھ کتاب ہوا
تھا آیا اہلِ خرابات کے سنوارنے کو — پر آکے بزم میں زاہد بہت خراب ہوا
وہاں تو شیشۂ مے توڑا، یاں دلِ رنداں — کوئی یہ پُوچھے کہ زاہد کو کیا ثواب ہوا

(کلیاتِ نظمِ آزاد،ص ۶۳)

چمنِ دہر سے نکلا نہ کوئی خوش ہوکر — آیا گل باغ میں خنداں،پہ پریشاں نکلا
مُردمِ دیدہ نے سمجھا ہے اسے طفلِ سرشک — پر یہ لڑکا تو کوئی تودہء طوفاں نکلا

(کلیاتِ نظمِ آزاد،ص ۵۳)

نہ دیکھا بھول کر تُو نے مری جانب تغافل سے — ہزاروں مرتبہ ہم نے تری محفل میں آ،دیکھا

(کلیاتِ نظمِ آزاد،ص ۶۰)

حباب گھر جو بناتا ہے روئے آب پہ تو — مکاں ترا ہو تو ہو،تُو یہاں مکیں تو نہیں

(کلیاتِ نظمِ آزاد،ص ۸۳)

'خُم کدہء آزاد' کے مرتب ڈاکٹر ہارون قادر کا بھی خیال ہے کہ:۔

''آزاد نے سنگلاخ زمینوں اور مشکل بحروں میں بھی غزلیں لکھیں لیکن اُن کی طبیعت غزل گوئی کی طرف مائل نہ تھی۔اُنہیں تو صرف زمانے کے دستور کے مطابق غزل کہنا پڑی۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں آورد

زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ زبان و بیان پر اگرچہ اُن کی گہری نظر ہے، قافیہ وردیف کا استعمال بھی درست ہے، لیکن تغزل کی چاشنی نہیں۔ فکری اعتبار سے ان میں اکثر جگہ طبیعت کی افسردگی، زمانے کی بے اعتنائی اور کسمپرسی جھلک رہی ہے۔ وہ غزلیں جو عالمِ جذب میں کہی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، ان میں زبان و بیان پر کوئی خاص توجہ نہیں البتہ عشق وتصوف کا گہرا اثر لئے ہوئے ہیں۔''(۸)

اب مرتب کی یہ رائے اور آزاد کی چند غزلوں کے اور اشعار ملاحظہ کیجئے، یا اس رائے سے لُطف اٹھایئے یا پھر آزاد کے ان اشعار سے:

چشمِ گریاں مری ہوتی نہ کبھی بے ساماں
دامنِ دشت نہ تھا دامنِ ساحل ہوتا

وصل اس کا نہیں ہوتا تو نہ ہوئے لیکن
دستِ امید تو گردن میں حمائل ہوتا

دیکھتا آئینہ دل میں جو یوسف یہ جمال
محوِ حیرت ترا اے حور شمائل ہوتا

(کلیاتِ نظم آزاد، ص۵۲)

مرضِ عشق نے کی جان کی مشکل آساں
درد سمجھے تھے جسے ہم، وہی درماں نکلا

کیا صبا پھونک گئی کان میں اے بلبلِ راز
ہے شگوفہ سے وہ ہنستا گل خنداں نکلا

(کلیاتِ نظم آزاد، ص۵۳)

نہ آیا ایک بھی نکتہ سمجھ میں حرفِ مطلب کا
کتابِ عشق کو از ابتدا تا انتہا دیکھا

گئے تم غیر کے گھر بھی تو کچھ شکوہ نہیں ہم کو
وہیں ہم مٹ گئے جس جا تمہارا نقشِ پا دیکھا

(کلیاتِ نظم آزاد، ص۶۰)

چراغِ حُسن پہ ساقی کے ہیں یہ پروانے
کہ گرتی آن کے مینا ہے برسرِ مینا

حباب دیکھ کے شیشہ میں مست حیراں ہیں
اتارا کیوں کہ ہے مینا میں ساغرِ مینا

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں جام دے ساقی
کہ تیرے سر پہ مرا خوں ہے یا سرِ مینا

(کلیاتِ نظم آزاد، ص۶۱)

تھا آیا اہلِ خرابات کے سنوارنے کو
پر آکے بزم میں زاہد بہت خراب ہوا

دلِ تپیدہ کی میں نے تڑپ جو دکھلائی
تو مرغِ بسمل اسے دیکھ کر کباب ہوا

(کلیاتِ نظم آزاد، ص۶۳)

نگاہِ مست سے تیری جو رنگ جام میں ہیں
لئے وہ حُسن نے رُخسارِ لالہ فام میں ہیں

نصیب ان کے جو، واں ہم سخن کلام میں ہیں
کہ ہم تو بیٹھے مزے لیتے اُن کے نام میں ہیں

شکیب و صبر کے آپہنچے ہم مقام میں ہیں
کبھی سلام میں ہیں اور کبھی پیام میں ہیں

دلِ جنوں زدہ کو میرے، وعظ سے کیا کام
یہ پختہ مغزِ خرد کس خیالِ خام میں ہیں

جہاں کے حسن ہیں تم میں کہ شاہِ حسن ہو تم
جو عیب پوچھو جہاں کے تو اس غلام میں ہیں

(کلیاتِ نظم آزاد، ص۷۸)

نگاہِ ساقیِ سرمست سے اُڑیں گے جام
شراب شیشہ و مینا میں گر نہیں تو نہیں

بنا کے گھر کوئی اس خاک داں میں کیا بیٹھے
کہ نقشِ خاک ہے، نقشِ سرِ نگیں تو نہیں

کھڑے ہیں مُردمِ دیدہ لیے ترازوِ عدل
دلوں کو دیکھنا پاسنگِ حُب وکیں تو نہیں

نہیں ہے شکوہ مجھے کیوں نہیں ہے لُطف و کرم
مجھے یہی ہے غنیمت کہ مجھ سے کیں تو نہیں
(کلیاتِ نظم آزاد، ص۸۳)

کدھر کو پھینکتے ہو گل وفا و الفت کے
ادھر تو آتا کبھی ناوکِ جفا بھی نہیں
مریضِ عشق کو ہے شوقِ مرگ کیا یارب
کہ موت اگر اُسے آتی نہیں، شفا بھی نہیں
وفا کا نام لیتے ہو اور روتا ہوں
کہ ہائے اہلِ وفا اب تو بے وفا بھی نہیں
(کلیاتِ نظم آزاد، ص۸۴)

باندھے ہے تیغ و سپر موج و حبابِ مئے ناب
گرم ہے معرکۂ کینہ وری شیشہ میں
وائے تقدیر کہ کس وقت مرا دور آیا
جب کہ باقی رہی ساقی نہ تَری شیشہ میں
دلِ دیوانہ پہ کب چلتا ہے گنڈا تعویذ
کہ یہ جان اُترے ہے مشکل سے ذری شیشہ میں
ساقیا ظلم ہے یہ فصلِ بہار اور اس میں
شیشہ ہو طاق پہ اور مے ہو بھری شیشہ میں
پھرتی ہے آنکھوں میں اے رشکِ پری چال تری
آشیاں گیر ہوا کبکِ دری شیشہ میں
(کلیاتِ نظم آزاد، ص۹۰)

حالی کے بعض پرستاروں کو تعجب ہوتا ہے کہ آزاد عالمِ ہوش میں بھی اور دورِ جنوں میں بھی حالی کے لئے ناملائم لفظ استعمال کرتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات معاصرین میں کوئی ایک ایسا مقابل آجاتا ہے، جس کے تقابل میں کسی کا تخلیقی ہنر ماند پڑ جاتا ہے، اسی لئے تو نیچرل شاعری اور سادگی کو اصلیت اور تاثیر کے جوہر سے ہم آمیخت کرنے کا جو میلہ وقت نے یا طاقت وروں نے لگایا تھا تو اسے حالی نے اپنے حِلم و اِنکسار کے باوجود لُوٹ لیا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد صادق ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد-احوال و آثار''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۱۱۰
۲۔ اسلم فرخی ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد-حیات و تصانیف''، جلد اول، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۱۹۶۵ء، ص۲۹۴
۳۔ اسلم فرخی ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد-حیات و تصانیف''، (جلد دوم)، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ص۵۹۸-۵۹۹
۴۔ محمد حسین آزاد'' آبِ حیات''، ترتیب و تدوین: ابرار عبدالسلام، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶ء، ص۵۰
۵۔ محمد حسین آزاد'' آبِ حیات''، ترتیب و تدوین: ابرار عبدالسلام، ص۳۳
۶۔ محمد حسین آزاد''نظم آزاد'' مرتبہ: آغا محمد باقر، لکشمی مینشن، دِی مال، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص۵۱-۵۲
۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، ''محمد حسین آزاد-حیات و تصانیف''، (جلد دوم)، ص۶۰۳-۶۰۴
۸۔ محمد حسین آزاد، ''کلیاتِ نظم آزاد''، مرتبہ: ڈاکٹر محمد ہارون قادر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۲۱